جناب مولانا عزیز زبیدی منڈی واربرٹن

الاستفتاء

منگووال غربی سے جناب طالب حسین طالب بی۔ اے لکھتے ہیں:

سمن آباد سے شائع شدہ ایک رسالہ "بلاغ القرآن" نظروں سے گذرا۔ اس میں جہلم کے ایک حافظ صاحب کا مراسلہ شائع ہوا ہے جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ولادتِ مسیح بے باپ نہیں ہے بلکہ ان کی ولادت اللہ تعالیٰ کے قانون "یا ایہا الناس انا خلقناکم من ذکر و انثیٰ" کے مطابق باقاعدہ مونث اور مذکر کے باہمی اختلاط کا نتیجہ ہے۔ نیز یہ کہ حضرت مریم باقاعدہ منکوحہ تھیں اور ان کے کفیل حضرت زکریا علیہ السلام نے باقاعدہ ان کی شادی کی تھی۔ براہِ کرم مسئلہ ولادتِ مسیح از روئے قرآن و حدیث شائع فرما دیں۔ نیز دلائل دیتے وقت مندرجہ ذیل آیاتِ مبارکہ کو پیشِ نظر رکھیں۔

یا ایہا الناس انا خلقنکم من ذکر و انثیٰ

لا تبدیل لکلمتہ

فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا لا تبدیل لخلق اللہ وذالک الدین القیم ولکن اکثر الناس لا یعلمون۔

طالب حسین طالب، محمد یونس ناز

منگووال غربی ضلع گجرات

الجواب: حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اللہ تعالیٰ نے اسی طرح بے باپ پیدا کیا جس طرح حضرت

آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے بغیر باپ کے پیدا فرمایا، عیسائی حضورؐ سے جھگڑتے کہ حضرت عیسیٰؑ خدا کے بیٹے ہیں ورنہ بتائیے کہ آپ کا باپ کون ہے؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

"اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ آدَمَ خَلَقَہٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ" (یونسؑ)

کہ "اللہ کے ہاں جیسے آدمؑ (ویسے عیسیٰؑ) کہ مٹی سے آدمؑ (کے پتلے) کو بناکر کہا بن جا، اور وہ بن گیا"

• یعنی تمہاں تعجب ہے کہ وہ بے باپ کیسے ہو گیا، حضرت آدمؑ کے باپ ہیں نہیں سوچتے کہ وہ تو باپ اور ماں دونوں نہیں رکھتے۔ اگر بے باپ ہونا خدا ہونے کی دلیل ہے تو حضرت آدمؑ کو تو بطریق اولیٰ خدا ہونا چاہیئے تھا" (ابن کثیر)

اوپر والی آیت اس امر پر واضح دلیل ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے باپ نہیں تھے یعنی مذکر و مؤنث کے اختلاط کا نتیجہ نہ تھے۔ بلکہ حضرت آدم علیہ السلام کی طرح کلمہ "کن" سے پیدا ہوئے تھے۔ اور اسی لیئے ان کا نام بھی کلمۃ اللہ پڑ گیا:

"اِنَّمَا الْمَسِیْحُ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ رَسُوْلُ اللّٰہِ وَکَلِمَتُہٗ" (النساء ع ۲۳)

کہ "مسیح عیسیٰ بن مریم تو بس اللہ کے ایک رسول ہی ہیں اور اس کا کلمہ!"

یعنی وہ کسی انسان کے نطفے کی پیداوار نہیں ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت مریمؑ کو حضرت عیسیٰؑ کی بشارت دی تو وہ بولیں:

"قَالَتْ رَبِّ اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ وَلَدٌ وَّلَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ" (آل عمران ع ۵)

کہ "اے میرے رب، میرے لڑکا کس طرح ہوگا درآنحالیکہ مجھے کسی مرد نے ہاتھ تک نہیں لگایا!"

اس پر رب نے یہ نہیں فرمایا کہ اب آپ کا نکاح کر دیں گے تو ہو جائیگا، بلکہ فرمایا کہ وہ اسطرح بھی پیدا کر دیتا ہے:

"قَالَ کَذٰلِکِ اللّٰہُ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ" (النساء ع ۵)

کہ "ارشاد ہوا، اللہ ایسے ہی پیدا کر دیتا ہے جو کچھ وہ چاہتا ہے"

کیونکہ وہ ان طریقوں کا پابند نہیں ہے جو تمہارے سامنے ہیں یا تمہیں معلوم ہیں بلکہ:

"اِذَا قَضٰی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ" (النساء ع ۵)

جب وہ کسی امر کے کرنے کا تہیا کر لیتا ہے تو بس اسے فرما دیتا ہے کہ "ہو جا! اور وہ

ہو جاتا ہے!"

سورۂ مریم میں بات اور واضح ہو گئی ہے کہ "وہ پردہ کر کے الگ جگہ جا کر تشریف فرما ہوئیں تو اللہ کا فرشتہ انسانی شکل وصورت میں سامنے آکھڑا ہوا" بولیں کہ اگر ایک انسان ہو تو میں تجھے رب کا واسطہ دیتی ہوں،" فرشتے نے کہا کہ "اسی طرح تیرے رب کا فرمان ہے کہ میرے لئے یہ معمولی بات ہے، ہم اسے اپنی قدرت کی نشانی بنانا چاہتے ہیں:

"اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَھْلِھَا مَکَانًا شَرْقِیًّا ہ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِھِمْ حِجَابًا فَاَرْسَلْنَا اِلَیْھَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَھَا بَشَرًا سَوِیًّا ہ قَالَتْ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْکَ اِنْ کُنْتَ تَقِیًّا ہ قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّکِ لِاَھَبَ لَکِ غُلٰمًا زَکِیًّا ہ قَالَتْ اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّلَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَکُ بَغِیًّا ہ قَالَ کَذٰلِکِ قَالَ رَبُّکِ ھُوَ عَلَیَّ ھَیِّنٌ وَلِنَجْعَلَہٗٓ اٰیَۃً لِّلنَّاسِ الآیۃ" (مریم ع۲)

ترجمہ: "جب وہ (مریمؑ) اپنے لوگوں سے الگ ہو کر پورب رُخ ایک جگہ جا بیٹھیں اور لوگوں کی طرف سے پردہ کر لیا تو ہم نے اپنی رُوح (روح القدس جبرائیلؑ) کو ان کی طرف بھیجا تو وہ اچھے خاصے آدمی کی شکل بن کر ان کے رُو برُو آکھڑے ہوئے (ان کو دیکھ کر) وہ بولیں کہ اگر تم متقی ہو تو میں تم کو رحمان کا واسطہ دیتی ہوں، وہ (جبرائیل امینؑ) بولے کہ میں بس تمہارے رب کا فرستادہ (فرشتہ ایلچی) ہوں تاکہ تم کو پاک طینت لڑکا دوں، وہ بولیں میرے لڑکا کیسے ہو سکتا ہے، حالانکہ مجھے نہ کسی بشر نے چھوا اور نہ میں بازاری عورت رہی۔ وہ (فرشتہ) بولے: تیرے رب نے اسی طرح کہا ہے کہ یہ میرے لئے معمولی بات ہے، غرض یہ ہے کہ میں اسے لوگوں کیلئے (اپنی قدرت کی) نشانی بناؤں۔"

تمثّل کے معنے ہوتے ہیں، بناوٹی شکل بنانا۔ بہر حال جبرائیلؑ تشریف لائے اور انسانی لباس میں، وہ دیکھ کر گھبرا گئیں۔ اب آپ غور فرمائیے کہ حضرت عیسٰیؑ اگر باپ کا نتیجہ تھے، تو اللہ تعالیٰ کا انہیں اپنی نشانی قرار دینے کے کیا معنیٰ؟ کیا دنیا میں اس قسم کی اور نشانیاں تھوڑی تھیں؟ پھر اسے ایک معمولی بات یعنی عام معمول کی بات کہا تو اسے بالخصوص "عَلَیَّ ھَیِّنٌ" (یہ میرے لئے آسان ہے) کہنے کے کیا معنیٰ؟ کیا حضرت عیسٰیؑ کی بات تو آسان تھی مگر معمول کے مطابق (مثلاً) معترض کی تخلیق رب کیلئے مشکل تھی؟ آخر اسے بالخصوص "آسان" کہنے کے کیا معنیٰ؟ آخر یہی کہنا پڑے گا کہ بغیر باپ

کے تخلیق کی بات تھی جسے بہرحال دنیا ناممکن تصور کرتی ہے۔ خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ جو بات تمہارے لئے ناممکن ہے، وہی میرے لئے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

پھر جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہوئی تو حضرت مریمؑ رو رو کر ہلکان ہوئیں اور بولیں کہ کاش اس سے پہلے مرگئی ہوتی یا میرا نام نشان ہی نہ باقی رہتا:

"قَالَتْ يٰلَيْتَنِیْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ۝ (مریم ع ۲)

"وہ بولیں، کاش میں اس سے پہلی ہی مرگئی ہوتی اور بھولی بسری ہوگئی ہوتی!"

کیا وہ عورت ایسا ہی کیا کرتی ہے جس کے گھر میں "چاند سا" لڑکا پیدا ہو اور پھر اس پر وہ خوش ہونے کی بجائے ماتم کرے؟

اور کہیں نہیں آپ ہی خدا کو حاضر ناظر کر کے بتائیں! کیا آپ کے ہاں ایسا ہوتا ہے؟ اصل بات یہی تھی کہ بے باپ ولادت ہوئی تھی اور محض حق تعالیٰ کی قدرت سے، لیکن معترض دوستوں کی طرح اس وقت بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں تھی جو اس کو قدرت کا کرشمہ قرار دینے کے بجائے الٹا اُسے ناجائز بچہ (العیاذ باللہ!) کی پھبتی کسنے لگ گئے تھے اس لیے غیرت اور بدنامی کے احساس سے وہ بولیں کہ کاش! میں بچہ جننے کے بجائے مرگئی ہوتی۔

کچھ دوستوں نے یہ تاویل پیش کی ہے کہ دراصل یہ ساری سرزنش بچہ کی بے باپ پیدائش پر نہیں تھی بلکہ صرف اس لئے تھی کہ اس نے رہ ورسم خانقاہی کے دستور کے برعکس متاہلانہ زندگی اختیار کر لی تھی۔ مگر قرآن وحدیث میں اس تاویل کے لئے کوئی قرینہ موجود نہیں ہے۔ ویسے بھی تجرد کی زندگی ان کے نزدیک نیکی سہی لیکن متاہلانہ زندگی "بدکاری" نہیں تصور کی جاتی تھی۔ ہاں اگر کوئی یوں کہتا کہ بظاہر تو خانقاہی زندگی تھی مگر دربردہ کچھ اور بات تھی تو شاید کچھ گنجائش نکل آتی۔ لیکن افسوس! بقول متاہلین کہ خانقاہی زندگی ترک کی اور نکاح کیا، تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اب شور کیوں نہ برپا ہوا؟ لیکن جب بچہ لے کر آئی تو ان کو خانقاہی زندگی کا صدمہ جاگ اٹھا؟ خانقاہیت تو نکاح ہونے مجروح ہوگئی تھی، اس وقت تو نہ بولے، جب بچہ ہوگیا تو قیامت برپا ہوگئی، اس میں کیا تک ہے؟ ——— لہٰذا یہ تاویل بالکل غلط ہے!

بہرحال اس پر قوم کے لوگ ملامت کرنے کو دوڑے کہ تو نے بڑے غضب کی حرکت کی، نہ تیرا باپ برا نہ ماں بدکار، پھر تو یہ بچہ کہاں سے لائی؟

"يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْئًا فَرِيًّا ۝ يٰٓاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّ

مَا كَانَتْ أُمُّكِ بَغِيًّا ؕ (مریم ۲۶)

ترجمہ: "وہ کہنے لگے کہ اے مریم تو نے بہت برا کام کیا، اے ہارون کی بہن، نہ تیرا باپ برا تھا اور نہ تیری ماں ہی بدکار تھی!"

سوچنے کی بات یہ ہے کہ جن کے ہاں لڑکا ہوتا ہے، کیا برادری مبارک دینے کو آتی ہے یا لعنت ملامت کرنے کو؟ ذرا اپنے ہاں کا دستور بتلایئے گا!

دریافت طلب بات یہ ہے کہ اگر حضرت مریمؑ کا شوہر تھا جو حضرت عیسیٰؑ کے باپ بنے تو قوم کو کیا سانپ سونگھ گیا تھا کہ وہ حضرت مریمؑ کو ملامت کرنے کو اٹھ دوڑے تھے؟ کیا وہ پاگل ہو گئے تھے؟ یہ بات بھی نہیں کہ دور کے لوگ ہیں یا صحیح صورتِ حال سے بے خبر تھے کیونکہ وہ برادری کے آدمی تھے۔ کیا برادری سے کوئی بات چھپی ہوتی ہے؟ ——— اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ معمول کے مطابق حمل کا کورس بھی پورا نہیں ہوا تھا۔ ورنہ عین موقع پر بولنے کے بجائے حمل کے دوران ہی شور برپا ہو جاتا۔ آیت کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ باہر ہی حمل ٹھہرا اور پھر باہر ہی باہر اس کی وضع ہوئی۔ ظاہر ہے کہ یہ بات معجزانہ تھی، عام متداول طبعی قوانین کی نہیں تھی۔ کیونکہ آیت میں آتا ہے کہ:

"فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ٥" (مریم ع ۲)

"پھر اسے حمل قرار پا گیا اور وہ اسے لئے ہوئے کہیں دور جگہ چلی گئیں"

اس کے بعد دردِ زہ اور ولادت کا بیان ہے اور پھر:

"فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ" (مریم ۲۶)

"وہ انہیں اٹھائے ہوئے اپنی قوم کے پاس آئیں"

اس تذکارے سے مترشح ہوتا ہے کہ جس طرح طبعی قوانین سے بالاتر حمل قرار پایا، اسی طرح طبعی ضابطوں سے بالاتر اس کی تکمیل اور وضع ہوئی، کیونکہ حمل کے بعد وہ دور چلی گئی تھیں ظاہر ہے یہ دس ماہ کیلئے نہیں تھا۔ پھر آتا ہے کہ وضع کے بعد اسے اٹھا کر اپنی قوم کے پاس آئیں (باہر باہر وقوعہ پیش آیا — فَانْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا، النساء ۲۶ — اور پھر حمل قرار پاتے ہی دور ہی دور چلی گئیں — مَكَانًا قَصِيًّا، النساء ۲۶ — اور وہاں ہی بچہ ہوا — اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ النساء ع۲ — اور پھر وہاں سے ہی قوم کے پاس آئیں — فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ) یہ سب باتیں اس امر کی غماز ہیں کہ نہ حمل طبعی قوانین کا نتیجہ تھا، نہ اس کا کورس، ادھر حمل ہوا، ادھر وضع حمل

کی تیاری!

قرآن کہتا ہے کہ عصمت محفوظ رہی تھی صرف "نفخ روح" ہوئی تھی:

"فاحصنت فرجہا فنفخنا فیہا من روحنا" (۲۱/۹۱)

"چنانچہ یہ وہ تھی جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی تھی، پس ہم نے نفخ روح کیا"

یہ "نفخ روح" والی بات کو آپ کس خانے میں فٹ کریں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ عام طبعی قوانین سے الگ کوئی معاملہ تھا ورنہ بالخصوص اس بات کو ذکر کرنے کے کیا معنی؟ — اگر شوہر والی بات کو تسلیم کر لیا جائے تو تمام تمہید غلط ہو کر رہ جائے گی — یہی بات حفاظت عصمت کے سلسلہ میں بھی کہی جا سکتی ہے کہ اگر شوہر والی تھیں تو یہ صفائی پیش کرنے کی کیا ضرورت پڑ گئی؟ یہ صرف اس لئے کہا گیا کہ شوہر والی بھی نہ تھیں مگر بچہ پیدا ہوا، اور کسی غلط حرکت کی مرتکب بھی نہ ہوئیں کہ با عصمت تھیں — ان تمام کڑیوں کو ملایئے، بات وہیں جا ٹھہرے گی جو ہم کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ بن باپ کی پیدائش ہیں، آپ کی بات کا تو کوئی سر پیر ہی نہیں، — ذرا ان الفاظ کو دوبارہ غور سے پڑھیے:

"ان مثل عیسیٰ عند اللہ کمثل آدم خلقہ من تراب ثم قال لہ کن فیکون"

اور:

"قالت رب انی یکون لی ولد ولم یمسسنی بشر"

دراصل یہ معترض دوست وہ طبقہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے بارے میں یہ یقین رکھتے ہیں کہ "یہ عجمی سازش کی پیداوار ہیں، اس لئے ان پر کسی نظریہ کی بنیاد قائم کرنا جائز نہیں ہے" مگر آپ یہ بات دیکھ کر حیران ہوں گے کہ ان کے جتنے مفروضات ہیں، ان کے لئے اساس بائیبل سے مہیا کرتے ہیں۔ وہ بائیبل جس کا حال یہ ہے کہ اسے ایمان اور نظریات کا ماخذ تصور کرتے ہوئے شرم آتی ہے — غور کیجئے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے "یوسف نجار" نامی والد کی دریافت بائیبل کی اتھاہ گہرائیوں سے نکال کر پیش کر رہے ہیں، وہی بات ہوئی کہ "گھر سے بیر اور غیر جان جان" افسوس یہ بے حمیتی کیوں — ! بہرحال ہم آپ کو ایک مسلمان کی حیثیت سے ایک دو حدیثیں بھی اسی سلسلے کی سنائے دیتے ہیں تاکہ بات مکمل ہو جائے:

شاہ نجاشی کے نام رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو مکتوب گرامی بھیجا تھا، اس میں یہ بھی تھا کہ "میں اس امر کی شہادت دیتا ہوں کہ حضرت عیسیٰ اللہ تعالیٰ کا ویسے ہی کلمہ اور روح ہیں جیسے حضرت

آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام!

«اشھد ان عیسیٰ بن مریم روح اللہ وکلمتہ القاھا الی مریم البتول الطیبۃ الحصینۃ فحملت بعیسیٰ فخلقہ اللہ من روحہ ونفخہ کما خلق آدم بیدہ»

(السیرۃ الحلبیۃ للامام الحلبی ص۲۷۹/۳)

شاہ نجاشی کے استفسار پر مہاجر صحابہؓ نے بھی اسی نظریہ کا اظہار کیا تھا:

نقول کما قال اللہ عز وجل روح اللہ وکلمتہ القاھا الی مریم العذراء البتول (ایضاً ص۳۶۹/۱)

نفخ وکلمہ!

نفخ اور کلمہ سے مراد خدا کا امر ہے، وہ معنے نہیں ہیں جو عام لئے جاتے ہیں۔

آیات کی تشریح

انا خلقنا کم من ذکر وانثیٰ:

یہ ایک عام طبعی قوانین کا ذکر ہے، لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت بغیر طبعی کرشمہ کی ایک عظیم بات ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت آدمؑ باوجودیکہ وہ انسان تھے، لیکن وہاں تو باپ کے ساتھ ماں کا سہارا بھی غائب ہے —— اصل میں معجزات خرق عادت کی باتیں ہوتی ہیں۔ اور یہ نظام قدرت کا ایک الگ نظام ہے جو ان طبعی قوانین سے بالاتر شاہی "مشیت" پر مبنی ہے۔ اسلئے اس نظام کو، جو ہم سے مخفی ہے، اس مشہود نظام پر قیاس نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ دونوں کے اثرات الگ الگ ہیں۔

لا تبدیل لکلمۃ اللہ:

یہ آیت اللہ کے دوستوں کے بارے میں آئی ہے۔

پہلے یہ ذکر ہے کہ ان کو قیامت میں خوف اور اندوہ کا سامنا نہیں ہوگا بلکہ دنیا اور آخرت میں ان کے لئے بشارت ہے۔ اس کے بعد فرمایا: لا تبدیل لکلمۃ اللہ (یونس ع۷) (اللہ کی باتیں تبدیل نہیں ہوتیں) یعنی اللہ نے جو اعلان اور وعدہ فرمایا ہے، اٹل ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنا وعدہ بدلا نہیں کرتے: "ان اللہ لا یخلف المیعاد" —— اس کو بہر حال اس مضمون سے کوئی تعلق نہیں، یہ بات

خدا کے وعدہ کی ہے، معترض کے طبعی ضابطہ کی نہیں ہے۔ جس کے لئے احباب اتنی لمبی چوڑی۔۔
کھینچا تانی فرما رہے ہیں وہ ایک لاحاصل تکلف ہے، علمی اور ہوش کی بات نہیں ہے۔

فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِیْ :

یہ آیت سورۂ روم نمبر ۳ (پارہ ۲۱) کی ہے۔ اس میں حکم ہوتا ہے کہ:

"سب طرف سے رخ موڑ کر دینِ حق کی طرف اپنا رخ سیدھا کر رکھئے۔ یہ وہ فطرۃ اللہ ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے سب کو پیدا کیا ہے:

"فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا" (روم ۴۲)

کہ "ایک خدا کے ہو کر اس کے دین کی طرف اپنا رخ کئے رہو، یہ خدائی فطرت ہے جس پر سب لوگوں کو پیدا فرمایا ہے"

دراصل ہمارے کرمفرما بات نہیں سمجھے، یہ کتاب طبیعات کی کتاب نہیں ہے کہ اس میں طبعی امور کا ذکر ہوگا بلکہ یہ روحانیات کی کتاب ہے جس میں روحانی فطرت کا بیان ہوتا ہے۔ دیکھئے! خدا فرماتا ہے کہ ہم نے انسان کو سب سے حسین پیدا فرمایا ہے:

"اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْۤ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ" (التین پ ۳۰)

تو کیا معروف معنوں میں انسان واقعی ایسا ہے؟ کیا ان میں اندھے، اپاہج، کوڑھی اور بدصورت نہیں ہوتے۔ کیا آپ اس سے یہ نتیجہ اخذ کریں گے کہ خدا کا قانون اب ٹوٹ گیا ہے؟

بہرحال قرآنِ مجید روحانیات کی کتاب ہے اور روحانیات کی اپنی ایک فطرت ہے جو طبعی فطرت سے ارفع اور اس سے مختلف ہوتی ہے۔ یہاں بھی وہی روحانی فطرت مراد ہے۔ یعنی اسلام اور معرفتِ الٰہی، ملاحظہ ہو بخاری شریف تفسیر سورۃ الروم:

"باب قولہ لا تبدیل لخلق اللہ لدین اللہ . . . . الفطرۃ الاسلام"

یعنی اللہ تعالیٰ نے معرفتِ الٰہی (اسلام) کا داعیہ ہر انسان کے خمیر میں داخل کیا ہے۔ خدا کا یہ دستور کبھی تبدیل نہیں ہوتا کہ کسی میں یہ استعداد رکھے اور کسی میں نہ رکھے۔ ایسا نہیں ہوتا۔

حکم ہوا تھا کہ دینِ حق پر اپنی توجہ مرکوز رکھو۔ کیونکہ یہ وہ فطری داعیہ ہے جو ہر مرد کی گھٹی میں داخل ہے جسے قرآن نے دوسری جگہ یوں بیان فرمایا ہے:

"وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِیْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى ۛۚ شَهِدْنَا" الآیۃ (پ ۹، اعراف ۲۲)

یعنی "(ان کو وہ وقت یاد دلائیے کہ) جب آپ کے رب نے اولادِ آدم یعنی انکی پیٹھوں سے ان کی نسلوں کو باہر نکالا اور ان کو اپنے اوپر گواہ بنایا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ تو وہ بولے، کیوں نہیں ہم گواہ ہیں!"

یہ سارا مکالمہ اسی فطری استعداد کا غماز ہے کہ ایک ماورا ہستی کا احساس ہر دل میں ہے، سدا ہے اور سدا رہے گا، ہاں خارجی عوامل سے اگر کوئی مسخ کرے تو اور بات ہے۔ حدیث میں اسے یوں بیان کیا گیا ہے کہ:

"ہر بچہ اپنی فطرت پر پیدا ہوتا ہے بعد میں اسے کوئی یہودی بنا لیتا ہے کوئی عیسائی"

"ما من مولود إلا یولد علی الفطرۃ فابواہ یہودانہ او ینصرانہ او یمجسانہ" الحدیث (بخاری باب مذکور)

گویا کہ خدا کی طرف رجحان ایک فطری امر ہے، اگر خارجی رکاوٹیں حائل نہ ہوں تو انسان ہمیشہ حق پر ہی قائم رہے۔ بس اسے فطرۃ اللہ کہا گیا ہے۔

امام بیضاوی فطرت کے معنے لکھتے ہیں:

"وھی قبولھم للحق وتمکنھم من ادراکہ" (بیضاوی ردم ص $\frac{29}{2}$)

اسی قسم کی باتیں تفسیر ابن کثیر وغیرہ میں بھی ہیں۔

واللہ اعلم وعلمہ اتم!